حَسَنَةً وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ اور سورۂ حدید میں حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى یعنی ان سب سے اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے پھر سورۂ انبیاء میں حسنیٰ کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دُور رکھے جائیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (بخاری)	یعنی تمام زمانوں میں میرا زمانہ بہتر ہے اسکے بعد اس زمانے کے لوگ بہتر ہیں جو میرے زمانے کے متصل ہیں پھر وہ جو انکے متصل ہیں۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ (ان کی قوتِ ایمان کیوجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کردے تو وہ انکے خرچ کئے ہوئے ایک مُد کی برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ نصف مُد کی برابر۔ مُد عرب کا ایک پیمانہ ہے جو تقریباً ہمارے آدھے سیر کی برابر ہوتا ہے (بخاری) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کو سارے جہان میں سے پسند فرمایا ہے پھر میرے صحابہ میں میرے لئے چار کو پسند فرمایا ہے۔ ابوبکر عمر عثمان علی رضی اللہ عنہم (رواہ البزار بسند صحیح) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبہم فبحبی احبہم ومن ابغضہم فببغضی ابغضہم ومن اٰذاھم فقد اٰذانی ومن اٰذانی فقد اٰذی اللہ ومن اٰذی اللہ فیوشک ان یاخذہ (رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن المغفل از جمع الفوائد)	اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملے میں میرے بعد ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ مت بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان کو محبت کی تو میری محبت کیساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کیساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اُسنے مجھے ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذاء دی اُسنے اللہ کو ایذاء پہنچائی اور جو اللہ کو ایذاء پہنچانے کا قصد کرے تو قریب ہے کہ اللہ اسکو عذاب میں پکڑ لے گا۔

آیات و احادیث اسکے متعلق بہت ہیں جن کو احقر نے اپنی کتاب **مقامِ صحابہ** میں جمع کر دیا ہے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ تمام صحابہ کرام کے عدل و ثقہ ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اور صحابہ کرام کے مابین جو اختلافات جنگ و قتال تک پہنچے انکے متعلق بحث و تمحیص اور تنقید و تحقیق یا سکوت کا مسئلہ بھی اس کتاب میں تفصیل کیساتھ لکھ دیا گیا ہے اور اسمیں سے بقدر ضرورت سورۂ محمد کی تفسیر میں آ چکا ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔ واللہ المستعان و علیہ التکلان

تمت بحمد اللہ وعونہ سورۃ الفتح للتاسع والعشرین من شعبان سنہ ١٣٩٠ھ وللہ الحمد اولہ و آخرہ

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانِ عَشَرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا

اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اسکے رسول سے اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا

اللہ سے، اللہ سنتا ہے جانتا ہے اے ایمان والو بلند نہ کرو

اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو

بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②

ایک دوسرے پر کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ کے پاس وہی ہیں جن کے

امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ③ اِنَّ

دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے ادب کے واسطے ان کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا جو

الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ④ وَ لَوْ

لوگ پکارتے ہیں تجھ کو دیوار کے پیچھے سے وہ اکثر عقل نہیں رکھتے اور اگر

اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤

وہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا ان کی طرف تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ سورت وشانِ نزول اس سے پہلی دو سُورتوں میں جہاد کے احکام تھے جس سے اصلاح عالم آفاق مقصود ہے۔ اس سورت میں اصلاحِ نفس کے احکام وآداب مذکور ہیں، خصوصاً وہ احکام جو آدابِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں اور قصہ ان آیتوں کے نزول کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ بات زیرِ غور تھی کہ اس قبیلہ پر حاکم کس کو بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رض نے قعقاع ابن معبد کی نسبت رائے دی اور حضرت عمر رض نے اقرع بن حابس کے متعلق رائے دی، اس معاملہ میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے مابین آپ کی مجلس میں گفتگو ہوگئی اور گفتگو بڑھ کر دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (رواہ البخاری)

اے ایمان والو اللہ اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو (یعنی جب تک قرائن قویہ سے یا بالتصریح گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو جیسا کہ واقعہ مذکورہ جو سببِ نزول ان آیات کا ہوا اُسمیں انتظار کرنا چاہیئے تھا کہ یا تو آپ خود کچھ فرماتے یا آپ حاضرینِ مجلس سے پُوچھتے بدون انتظار کے از خود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا کیونکہ گفتگو کا جواز اذنِ شرعی پر موقوف تھا خواہ یہ اذن قطعی ہو یعنی صریح طور پر یا ظنی قرائن قویہ کے ذریعہ ظنی یہ ہوئی انتظار نہیں کیا، اسپر یہ آیت نازل ہوئی) اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ (تمھارے سب اقوال کو) سُننے والا (اور تمھارے افعال کو) جاننے والا ہے (اور) اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ اُن سے ایسے کھُل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھُل کر بولا کرتے ہو (یعنی نہ بلند آواز سے بولو جبکہ آپکے سامنے آپس میں کوئی بات کرنا ہو اور نہ برابر کی آواز کے بولو جبکہ خود آپ سے خطاب کرنا ہو) کبھی تمھارے اعمال برباد ہو جاویں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز کا بلند کرنا جو صورۃً بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں یہ ایک قسم کی گستاخی ہے اپنے تابع اور خادم سے اس طرح کی گفتگو ناگوار اور ایذا دہ ہوسکتی ہے اور اللہ کے رسُول کو ایذا پہنچانا تمام اعمالِ خیر کو برباد کر دینے والا ہے۔ البتہ بعض اوقات جبکہ طبیعت میں زیادہ انبساط ہو یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اسوقت عدمِ ایذاءِ رسُول کیوجہ سے یہ گفتگو حبطِ اعمال کا موجب نہیں ہوگی، لیکن متکلم کو یہ معلوم کرنا کہ اسوقت ہماری ایسی گفتگو ناگوار خاطر اور موجبِ ایذا نہیں ہوگی آسان نہیں ہوسکتا ہے کہ تکلم تو یہ سمجھ کر کلام کرے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہیں ہوگی مگر واقع میں اس سے ایذاء پہنچ جائے تو گفتگو اسکے اعمال کو حبط اور برباد کر دے گی اگرچہ اس کو گمان بھی نہ ہوگا کہ

میری اس گفتگو سے مجھے کتنا بڑا خسارہ ہوگیا، اسلئے آواز بلند کرنے اور جہر بالقول کو مطلقاً ممنوع کر دیا گیا کیونکہ ایسی گفتگو کے بعض افراد اگرچہ موجبِ ایذاء وحبطِ اعمال نہیں ہونگے مگر اسکی تعیین کیسے ہوگی اسلئے مطلقاً جہر بالقول کے تمام افراد کو ترک کر دینا چاہیئے یہانتک تو آواز بلند کرنے سے ڈرایا گیا ہے آگے آواز پست کرنے کی ترغیب ہے)

بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے (یعنی اُن کے قلوب میں تقویٰ کے خلاف کوئی چیز آتی ہی نہیں، مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں حضرات کمالِ تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ ترمذی کی حدیث مرفوع میں کمال تقویٰ کا بیان اس الفاظ میں آیا ہے (لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا باس بہ حذرا لما بہ باس، یعنی بندہ کمالِ تقویٰ کو اسوقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کچھ ایسی چیزوں کو بھی جنمیں کوئی گناہ نہیں اس احتیاط کی بناء پر چھوڑ دے کہ یہ جائز کام کہیں مجھے کسی ناجائز کام میں مبتلا نہ کردے۔ مراد وہ مشتبہ امور ہیں جن میں گناہ کا خطرہ اور شبہہ ہو۔ جیسا کہ آواز بلند کرنے کی ایک فرد ایسی ہے جس میں گناہ نہیں، یعنی وہ جس میں مخاطب کو ایذا نہ ہو۔ اور ایک فرد وہ ہے جس میں گناہ ہے یعنی جس سے ایذا پہنچے، تو کمالِ تقویٰ اسمیں ہے کہ آدمی مطلقاً آواز بلند کرنے کو چھوڑ دے، آگے ان کے عمل کے اُخروی فائدہ کا بیان ہے) اُن لوگوں کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ اور اگلی آیتوں کا قصہ یہ ہے کہ وہ ہی بنو تمیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ باہر تشریف فرما نہ تھے بلکہ ازواجِ مطہرات کے حجرات میں سے کسی مکان میں تھے۔ یہ لوگ غیر مہذب گاؤں والے تھے باہر ہی سے کھڑے ہوکر آپ کا نام لیکر پکارنے لگے کہ یا محمد اخرج الینا، یعنی اے محمد ہمارے لئے باہر آیئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (کذا فی الدر المنثور بروایۃ ابن اسحٰق عن ابن عباس رض) جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں اُن میں اکثروں کو عقل نہیں ہے (کہ عقل ہوتی تو آپ کا ادب کرتے اسطرح نام لیکر باہر سے پکارنے کی جرأت نہ کرتے۔ اور اکثر ہم فرمانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بعض پکارنے والے فی نفسہٖ جری نہ ہوں گے، دوسروں کیساتھ دیکھا دیکھی لگ گئے اس طرح اُن سے بھی یہ غلطی ہوگئی اور یا اگرچہ سب ایک ہی طرح کے ہوں مگر اکثر ہم کا لفظ فرمانے سے کسی کو اشتعال نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرسکتا ہے کہ شاید مجھ کو کہنا مقصود نہ ہو۔ وعظ ونصیحت کا یہی طریقہ ہے کہ ایسے کلمات سے احتیاط کیجائے جن سے مخاطب کو اشتعال پیدا ہو) اور اگر یہ لوگ (ذرا) صبر (اور انتظار) کرتے یہانتک کہ آپ خود باہر انکے پاس آجاتے تو یہ انکے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معافی ہوجاوے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کے نزول کے متعلق روایات حدیث میں بقول قرطبی چھ واقعات منقول ہیں اور قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ سب واقعات صحیح ہیں کیونکہ وہ سب واقعات مفہوم آیات کے عموم میں داخل ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بروایت بخاری ذکر کیا گیا ہے۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ، بَیْنَ الْیَدَیْنِ کے اصل معنے دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں مراد اس سے سامنے کی جہت ہے یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقدم اور پیشقدمی نہ کرو کس چیز میں پیشقدمی کو منع فرمایا ہے قرآن کریم نے اسکو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کیطرف ہے کہ کسی قول یا فعل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشقدمی نہ کرو بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیتے ہیں، ہاں آپ ہی کسی کو جواب کے لئے مامور فرمادیں تو وہ جواب دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ بڑھے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے مگر یہ کہ آپکی تصریح یا قرائن قویہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ خود ہی کسی کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

علمائے دین اور دینی مقتداؤں کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء و مشائخ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارثِ انبیاء ہیں اور دلیل اسکی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوالدرداء رضؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضؓ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دُنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دُنیا میں آفتاب کا طلوع و غروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر سے بہتر و افضل ہو (روح البیان از کشف الاسرار) اسلئے علماء نے فرمایا کہ اپنے اُستاد اور مرشد کیساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ، یہ دوسرا ادب مجلسِ نبوی کا بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا کیا کرتے ہیں ایک قسم کی بے ادبی گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول سے صحابۂ کرام کا یہ حال ہوگیا کہ حضرت ابوبکر رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (درِ منثور عن البیہقی) اور حضرت عمر رضؓ اسقدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کذا فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیس رضؓ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سنکر وہ بہت

ڈرے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا (بیان القرآن از دُرِّ منثور)

روضۂ اقدس کے سامنے بھی بہت بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ممنوع ہے

قاضی ابوبکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے بھی زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح جس مجلس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی یا بیان کیجارہی ہوں اُس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے کیونکہ آپ کا کلام جسوقت آپؐ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اسوقت سب کے لئے خاموش ہو کر اسکا سُننا واجب ضروری تھا اسی طرح بعد وفات جس مجلس میں آپ کا کلام سُنایا جاتا ہو وہاں شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔

مسئلہ۔ جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء ہونیکے داخل ہیں اسی طرح رفع صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے اُن کی آواز دب جائے (قرطبی)

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ، لفظ اَنْ تَحْبَطَ مفعول لہٗ ہے لَا تَرْفَعُوْٓا کا جس میں حکم کی علت بتلائی گئی ہے۔ بحذف مضاف یعنی خشیۃ ان تحبط معنے آیت کے یہ ہوئے کہ اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو بسبب اس خطرہ اور خوف کے کہ کہیں تھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلّمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ حبط اعمال یعنی اعمالِ صالحہ کو ضائع کردینے والی چیز تو باتفاق اہلِ سُنّت والجماعت صرف کفر ہے۔ کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمالِ صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مُومنین اور صحابۂ کرام کو ہے اور لفظ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر نہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبط اعمال کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے مومن نہیں ہوتا اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ، یعنی تمھیں خبر بھی نہ ہو تو حبطِ اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوگی۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ رحمہ نے بیان القرآن میں اسکی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ سب اشکالات و سوالات ختم ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو تم رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو، کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمھارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں، اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسولؐ سے پیشقدمی یا اُن کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرکے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسولؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونیکا بھی

احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول کا۔ اگرچہ صحابہ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذار کا سبب بنے لیکن بعض اعمال و افعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذار نہ ہوں پھر بھی اُن سے ایذار کا احتمال ہے اسی لئے اُن کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبطِ اعمال کا۔ کسی اپنے دینی مقتدار استاد یا مرشد کی ایذار رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھیریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہو جائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچا دے جس سے تمام اعمالِ صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصداً ایذار کا نہ کیا تھا اسلئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلار کفر اور حبطِ اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔ بعض علمار نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہو اسکے ساتھ گستاخی و بے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاعِ ایمان کو بھی ضائع کر دیتی ہے نعوذ باللہ منہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُـجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، اس آیت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک تیسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوارپن کے ساتھ کہ نام لیکر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے عقل والوں کے یہ کام نہیں۔ حجرات، حجرہ کی جمع ہے اصل لغت میں حجرہ ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقف عمارت ہو۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات مدینہ طیبہ میں نو تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک حجرہ الگ الگ تھا جن میں آپ باری باری تشریف فرما ہوتے تھے۔

حجرات امہات المؤمنین | ابن سعد نے بروایت عطار خراسانی لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں سے بنے ہوئے تھے اور اُن کے دروازوں پر موٹے سیاہ اُون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے میرا گمان یہ ہے کہ حجرہ کے دروازہ سے مسقف بیت تک چھ سات ہاتھ ہوگا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اونچائی سات آٹھ ہاتھ ہوگی۔ یہ حجرات امہات المؤمنین ولید بن عبدالملک کی حکومت میں اُن کے حکم سے مسجدِ نبوی میں شامل کر دیئے گئے۔ مدینہ میں اُس روز لوگوں پر گریہ کا طاری تھی۔

سببِ نزول | امام بغوی نے بروایت قتادہ رضہ ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ کی خدمت

میں حاضر ہوئے تھے جن کا ذکر اُوپر آیا ہے۔ یہ دوپہر کے وقت مدینہ میں پہنچے جبکہ آپ کسی حجرہ میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ لوگ اعراب آدابِ معاشرت سے ناواقف تھے۔ اُنھوں نے حجرات کے باہر ہی سے پکارنا شروع کر دیا، اخرج الینا یا محمد اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس طرح پکارنے کی ممانعت اور انتظار کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسند احمد۔ ترمذی وغیرہ میں بھی یہ روایت مختلف الفاظ سے آئی ہے (مظہری)

تنبیہ | صحابہ و تابعین نے اپنے علمار و مشائخ کے ساتھ بھی اسی ادب کا استعمال کیا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضہ سے منقول ہے کہ جب میں کسی عالم صحابی رض سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو انکے مکان پر پہنچکر ان کو آواز یا دروازہ پر دستک دینے سے پرہیز کرتا اور دروازہ کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لاویں گے اسوقت اُن سے دریافت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، آپ نے دروازہ پر دستک دیکر کیوں نہ اطلاع کر دی تو ابن عباس نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اُن کے باہر آنیکا انتظار کیا جائے۔ حضرت ابو عبیدہ رض نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازہ پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اسکا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لاویں گے اسوقت ملاقات کروں گا (روح المعانی)

مسئلہ:۔ آیت مذکورہ میں حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ میں اِلَيْهِمْ کی قید بڑھانے سے یہ ثابت ہوا کہ صبر و انتظار اسوقت تک کرنا ہے جب تک کہ آپ لوگوں سے ملاقات و گفتگو کے لئے باہر تشریف لائیں، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا باہر تشریف لانا کسی دوسری ضرورت سے ہو اسوقت بھی آپ سے اپنے مطلب کی بات کرنا مناسب نہیں بلکہ اسکا انتظار کریں کہ جب آپ اُن کی طرف متوجہ ہوں اسوقت بات کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا

اے ایمان والو اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر تو تحقیق کر لو کہیں جا نہ پڑو

قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ⑥

کسی قوم پر نادانی سے پھر کل کو اپنے کئے پر لگو پچھتانے

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جس میں کسی کی شکایت ہو) تو (بدون تحقیق کے اس پر عمل نہ کیا کرو بلکہ اگر عمل کرنا مقصود ہو تو) خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول اس آیت کے نزول کا واقعہ ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد یہ نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار بن ابی ضرار جن کی صاحبزادی حضرت جویریہؓ بنت حارث امہات المؤمنین میں سے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، میں نے اسلام کو قبول کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ اب میں اپنی قوم میں جاکر ان کو بھی اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے میں اُن کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا۔ اور آپ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیجدیں تاکہ جو رقم زکوٰۃ کی میرے پاس جمع ہوجائے اس کو سپرد کردوں، پھر جب حارث نے حسبِ وعدہ ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حارث کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حارث نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجاویں۔ ادھر واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر ولید بن عقبہؓ کو اپنا قاصد بناکر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجدیا تھا مگر ولید بن عقبہ کو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلہ کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے قتل کرڈالیں اس خوف کے سبب وہ راستہ ہی سے واپس ہوگئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جاکر یہ کہا کہ اُن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اسپر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک دستہ مجاہدین کا روانہ کیا، ادھر یہ دستہ مجاہدین کا روانہ ہوا ادھر سے حارث مع اپنے ساتھیوں کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلے، مدینہ کے قریب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حارث نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں کیطرف بھیجے گئے ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ حارث نے سبب پوچھا تو ان کو واقعہ ولید بن عقبہ کے بھیجنے کا اور انکی واپسی کا بتلایا گیا اور یہ کہ ولید بن عقبہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حارث نے یہ سُن کر کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بناکر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ اس کے بعد حارث جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حارث نے کہا کہ ہرگز نہیں، قسم ہے اُس

ذات کی جسنے آپ کو پیغام حق دیکر بھیجا ہے نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے انکو دیکھا۔ پھر جب مقررہ وقت پر آپ کا قاصد نہ پہنچا تو مجھے خطرہ ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا جس پر حضور ناراض ہوئے اس لئے میں حاضرِ خدمت ہوا۔ حارث نے فرماتے ہیں کہ اس پر سورۂ حجرات کی آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

اور بعض روایات میں ہے کہ ولید بن عقبہؓ جب المصطلق بنی المصطلق میں پہنچے، اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضورؐ کا قاصد آویگا یہ تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہؓ کو شبہ ہوگیا کہ یہ شاید پرانی دشمنی کیوجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں یہیں سے واپس ہوگئے اور جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گمان کے مطابق یہ عرض کردیا کہ وہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار نہیں بلکہ میرے قتل کے درپے ہوئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی کہ خوب تحقیق کرلیں اسکے بعد کوئی اقدام کریں۔ خالد بن ولیدؓ نے بستی سے باہر رات کو پہنچکر قیام کیا اور تحقیقِ حال کے لئے چند آدمی بطور جاسوس کے خفیہ بھیجدیئے۔ ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام وایمان پر قایم، نماز وزکوٰۃ کے پابند ہیں اور کوئی بات خلافِ اسلام نہیں پائی گئی، خالد بن ولیدؓ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یہ ابن کثیر کی متعدد روایات کا خلاصہ ہے)

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شریر فاسق آدمی اگر کسی شخص یا قوم کی شکایت کرے اُنپر کوئی الزام لگائے تو اسکی خبر یا شہادت پر بغیر مکمل تحقیق کے عمل کرنا جائز نہیں۔

آیت سے متعلقہ احکام ومسائل امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اسوقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کرکے اسکا صدق ثابت نہ ہوجائے، کیونکہ اس آیت میں ایک قراءت تو فتثبتوا کی ہے جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو بلکہ ثابت قدم رہو جب تک دوسرے ذرائع سے اسکا صدق ثابت نہ ہوجائے۔ اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا . . . . . .

. . . . . تو شہادت کو قبول کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا کیونکہ ہر شہادت ایک خبر ہوتی ہے جو حلف وقسم کے ساتھ موکد کیجاتی ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت شرعاً مقبول نہیں۔ البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آیت قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے یعنی اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ۔ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے اس کی مزید تفصیل کتبِ فقہ معین الحکام وغیرہ میں ہے

اور احقر نے احکام القرآن عربی حزب سادس میں اس کی تفصیل لکھدی ہے اہلِ علم اسمیں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک اہم سوال وجواب متعلقہ عدالتِ صحابہ

اس آیت کا ولید بن عقبہؓ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے اور آیت میں اُن کو فاسق کہا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی فاسق بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ اُس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کیخلاف ہے کہ الصحابۃ کلہم عدول، یعنی صحابۂ کرام سب کے سب ثقہ ہیں ان کی کسی خبر و شہادت پر کوئی گرفت نہیں کیجا سکتی۔ علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہی جسکی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں اُن سے گناہِ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو فسق ہے اور اُس گناہ کے وقت اُن کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کیجائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو انکی خبر و شہادت رد کردی جائے گی لیکن عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا نصوصِ قرآن وسنت کی بناء پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہوگیا ہو۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ الآیۃ، اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی (جیسا کہ قاضی ابویعلی نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ انکی وفات موجباتِ رضا پر ہوگی (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گنے چُنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو اُن کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے حق تعالیٰ نے اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت اُن کی طبیعت بن گئی تھی۔ خلافِ شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا اُن کے اعمالِ صالحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اسکے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی۔ ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت اُن کا خوفِ خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کر دینا کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ روایاتِ حدیث میں معروف و مشہور ہیں اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے حسب ارشاد قرآن اعمالِ صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡھِبۡنَ السَّیِّاٰتِ خصوصاً

جبکہ اُن کے حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابو داؤد و ترمذی نے حضرت سعید بن زید سے نقل کیا ہے کہ واللّٰہ لمشھد رجل منھم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمر عمر نوح، یعنی خدا کی قسم ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جسمیں اُن کے چہرہ پر غبار پڑ گیا ہو تمھاری عمر بھر کی طاعت عبادت سے افضل ہے اگرچہ اس کو عمرِ نوح علیہ السلام دیدی گئی ہو۔ اسلئے ان سے صدورِ گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لئے مقرر تھا مگر اسکے باوجود بعد میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے، اسلئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہوا اور اسوقت ان کو فاسق کہا بھی گیا تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو انکے لئے مستمر سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے (کذا فی الروح)

اور آیتِ مذکورہ میں تو قطعاً یہ ضروری نہیں کہ ولید بن عقبہ کو فاسق کہا گیا ہو سببِ نزول خواہ اُن کا معاملہ ہی سہی مگر لفظ فاسق اُن کے لئے استعمال کیا گیا یہ ضرور نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو ولید بن عقبہ سے کوئی ایسا کام ہوا نہ تھا جس کے سبب ان کو فاسق کہا جائے اور اس واقعہ میں بھی جو انھوں نے بنی المصطلق کے لوگوں کی طرف ایک بات غلط منسوب کی وہ بھی اپنے خیال کے مطابق صحیح سمجھ کر کی اگرچہ واقع میں غلط تھی اس لئے آیت مذکورہ کا مطلب بے تکلف وہ بن سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اوپر گزرا ہے کہ اس آیت نے قاعدہ کلیہ فاسق کی خبر کے نامقبول ہونیکے متعلق بیان کیا ہے اور واقعہ مذکورہ پر اس آیت کے نزول سے اسکی مزید تاکید اس طرح ہوگئی کہ ولید بن عقبہ اگرچہ فاسق نہ تھے مگر ان کی خبر قرائن قویہ کے اعتبار سے ناقابلِ قبول نظر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض انکی خبر پر کسی اقدام سے گریز کر کے خالد بن ولید کو تحقیقات پر مامور فرما دیا تو جب ایک ثقہ اور صالح آدمی کی خبر میں قرائن کی بناء پر شبہ ہو جانیکا معاملہ یہ ہے کہ اسپر قبل از تحقیق عمل نہیں کیا گیا تو فاسق کی خبر کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اور زیادہ واضح ہے۔ عدالتِ صحابہ کی مکمل بحث احقر نے اپنی کتاب مقامِ صحابہ میں بیان کردی جو شائع ہو چکی ہے اور اسکا کچھ حصہ اگلی آیت وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الآیۃ کے تحت میں بھی آجائے گا۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ

اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا اگر وہ تمھاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں

لَعَنِتُّمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ

تو تم پر مشکل پڑے پر اللہ نے محبت ڈالدی تمھارے دل میں ایمان کی اور کھبا دیا اسکو تمھارے دلوں میں اور

كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴿٧﴾

نفرت ڈالدی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر

فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٨﴾

اللہ کے فضل سے اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا

خلاصۂ تفسیر

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما) ہیں (جو خدا کی بڑی نعمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ لقد منّ اللہ الآیۃ) اس نعمت کا شکریہ ہے کہ کسی بات میں تم آپکے خلاف مت کرو گو دُنیوی ہی کیوں نہ ہو اور اس فکر میں مت پڑو کہ اُمورِ دنیویہ میں خود حضورؐ ہماری رائے کی موافقت فرمایا کریں کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ اسمیں تمھارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے کیونکہ وہ مصلحت کے خلاف ہو تو ضرور اسکے موافق عمل کرنے میں مضرت ہو بخلاف اسکے کہ آپ کی رائے پر عمل کیا جائے کیونکہ امرِ دُنیوی ہونے کے باوجود اسمیں خلاف مصلحت ہونیکا احتمال گو فی نفسہٖ مستبعد اور خلاف شانِ نبوت نہیں لیکن اوّل تو ایسے امور جن میں ایسا احتمال ہو شاذ و نادر ہوں گے پھر اگر ہوں بھی اور اُن میں مصلحت فوت ہو بھی جاوے تو یہ کیتنی بڑی بات ہے کہ اس مصلحت کا نعم البدل یعنی اجر و ثوابِ اطاعتِ رسول کا ضرور ہی میسّر ہوگا بخلاف اسکے تمھاری رائے پر عمل ہو کہ گو شاذ و نادر ایسے اُمور بھی نکلیں گے جن میں مصلحت تمھاری رائے کے موافق ہو لیکن متعین تو ہیں نہیں اور پھر بہت ہی کم ہونگے زیادہ احتمال مضرت ہی کا ہے پھر اس مضرت کا کوئی تدارک نہیں اور اس تقریر سے فائدہ کثیر کی قید کا بھی معلوم ہوگیا، بہرحال اگر آپ تم لوگوں کی موافقت کرتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑتے) لیکن اللہ تعالےٰ نے (تم کو مصیبت سے بچا لیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمھارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق (یعنی گناہِ کبیرہ) اور (مطلق) عصیان (یعنی گناہِ صغیرہ) سے تم کو نفرت دیدی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسول کی جستجو رہتی ہے اور جس سے تم اُن احکام کو مان لیتے ہو جو رضائے رسول کے موجبات ہیں چنانچہ جب تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُمورِ دنیویہ میں بھی اطاعت رسول کی واجب ہے اور بدون اطاعت مطلقہ کے ایمان کامل نہیں ہوتا اور ایمان کامل کی تحصیل کی رغبت پہلے سے موجود ہے پس تم نے فوراً اُس حکم کو بھی قبول کرلیا اور قبول کرکے ایمان کی اور تکمیل کرلی) ایسے لوگ (جو کہ تکمیلِ ایمان کے محب ہیں) خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہِ راست پر ہیں اور اللہ تعالےٰ (نے جو یہ احکام فرمائے ہیں تو وہ اُنکی مصلحتوں کو) جاننے والا (ہے اور چونکہ) حکمت والا ہے (اس لئے ان احکام کو واجب کر دیا ہے)

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں واقعہ حضرت ولید بن عقبہ اور قبیلہ بنی المصطلق کا مذکور تھا جسمیں ولید بن عقبہ نے بنی المصطلق کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ مرتد ہوگئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اسپر صحابۂ کرام میں بھی اشتعال پیدا ہوا انکی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں پر جہاد کے لئے مجاہدین کو بھیجدیا جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کی خبر کو قرائن قویہ کیخلاف سمجھ کر قبول نہ کیا اور تحقیقات کے لئے حضرت خالد بن ولید کو مامور فرمادیا۔ پچھلی آیت میں قرآن کریم نے اسکو قانون بنادیا کہ جس شخص کی خبر میں قرائن قویہ سے کوئی شبہ ہوجاوے تو قبل از تحقیق اُس پر عمل جائز نہیں۔ اس آیت میں صحابۂ کرام کو ایک اور ہدایت کی گئی ہے کہ اگرچہ بنی المصطلق کے متعلق خبر ارتداد سُن کر تمھارا جوش غیرتِ دینی کے سبب تھا مگر تمھاری رائے صحیح نہ تھی۔ اللہ کے رسول نے جو صورت اختیار کی وہی بہتر تھی (مظہری) مقصد یہ ہے کہ مشورہ طلب امور میں کوئی رائے دیدینا تو درست ہے لیکن یہ کوشش کرنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمھاری رائے کے مطابق ہی عمل کریں یہ درست نہیں کیونکہ اُمورِ دُنیویہ میں اگرچہ شاذ و نادر رسول کی رائے خلاف مصلحت ہونیکا امکان ضرور ہے جو شانِ نبوت کیخلاف نہیں لیکن حق تعالیٰ نے جو فراست اور دانش اپنے رسول کو عنایت فرمائی ہے وہ تمھیں حاصل نہیں ہے اسلئے اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمھاری رائے پر چلا کریں تو بہت سے معاملات میں نقصان و مصیبت میں پڑ جاؤگے۔ اور کہیں شاذ و نادر تمھاری رائے ہی میں مصلحت ہو اور تم اطاعتِ رسول کیلئے اپنی رائے کو چھوڑ دو جس سے تمھیں کچھ دُنیوی نقصان بھی پہنچ جاوے تو اسمیں اتنی مضرت نہیں جتنی تمھاری رائے کے تابع ہو کر چلنے میں ہے کیونکہ اس صورت میں اگر کچھ دُنیوی نقصان ہو بھی گیا تو اطاعتِ رسول کا اجر و ثواب اسکا بہتر بدل موجود ہے اور لفظ عَنِتُّم، عَنَت سے مشتق ہے جس کے معنی گناہ کے بھی آتے ہیں اور کسی مصیبت میں مبتلا ہونیکے بھی یہاں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں (قرطبی)

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِن بَغَتْ

اور اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرادو پھر اگر چڑھا چلا جائے

إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ

ایک اُن میں سے دوسرے پر تو تم سب لڑو اُس چڑھائی والے سے یہانتک کہ پھر آئے اللہ کے حکم

اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ

پر پھر اگر پھر آیا تو ملاپ کرادو اُن میں برابر اور انصاف کرو بیشک

اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا

اللہ کو خوش آتے ہیں انصاف والے مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں سو ملاپ کرادو

بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

اپنے دو بھائیوں میں اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم پر رحم ہو

ع ۱ ۱۰ ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کردو (یعنی جھگڑے کی بنیاد کو رفع کرکے لڑائی موقوف کرادو) پھر اگر (اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) اُن میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے (اور لڑائی بند نہ کرے) تو اُس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جاوے (حکم خدا سے مراد لڑائی بند کرنا ہے) پھر اگر وہ (زیادتی کرنے والا فرقہ حکم خدا کی طرف) رجوع ہو جاوے (یعنی لڑائی بند کردے) تو اُن دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو (یعنی حدود شرعیہ کے موافق اس معاملہ کو طے کردو محض لڑائی بند کرنے پر اکتفا نہ کرو اگر صلح مصالحت نہ ہوئی تو پھر بھی لڑائی کا احتمال رہے گا) اور انصاف کا خیال رکھو (یعنی کسی نفسانی غرض کو غالب نہ ہونے دو) بیشک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے (اور باہمی اصلاح کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ) مسلمان تو سب (دینی اشتراک جو روحانی اور معنوی رشتہ ہے اس رشتہ سے ایک دوسرے کے) بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کردیا کرو (تاکہ یہ اسلامی برادری قائم رہے) اور (اصلاح کے وقت) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (یعنی حدود شرعیہ کی رعایت رکھا کرو) تاکہ تم پر رحمت کیجاوے۔

معارف و مسائل

ربط سابقہ آیات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب اور ایسے اعمال سے پرہیز کا بیان تھا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے، آگے عام معاشرت کے آداب احکام ہیں جن میں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے آداب اور باہمی حقوق کا بیان ہے اور سب میں قدر مشترک ایذاء رسانی سے اجتناب ہے۔

سبب نزول ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان فرمائے ہیں جن میں خود مسلمانوں کے دو گروہوں میں باہم تصادم ہوا اور کوئی بعید نہیں کہ یہ سبھی واقعات کا مجموعہ سبب نزول ہوا ہو یا نزول کسی ایک واقعہ میں ہوا، دوسرے واقعات کو اس کے مطابق پاکر انکو بھی سبب

نزول میں شریک کردیا گیا۔ اس آیت کے اصل مخاطب وہ اولوالامر اور ملوک ہیں جن کو قتال و جہاد کے وسائل حاصل ہیں (کذا قال ابو حیان فی البحر واختارہ فی روح المعانی) اور بالواسطہ تمام مسلمان اسکے مخاطب ہیں کہ وہ اس معاملے میں اولوالامر کی اعانت کریں۔ اور جہاں کوئی امام و امیر یا بادشاہ و رئیس نہیں وہاں حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کو فہمائش کرکے ترک قتال پر آمادہ کیا جائے، اور دونوں نہ مانیں تو دونوں لڑنے والے فرقوں سے الگ رہے نہ کسی کیخلاف کرے نہ موافقت، کذا فی بیان القرآن۔

مسائل متعلقہ مسلمانوں کے دو گروہوں کی باہمی لڑائی کی چند صورتیں ہوتی ہیں، ایک کہ دونوں جماعتیں امام المسلمین کے تحت ولایت ہیں یا دونوں نہیں، یا ایک ہے ایک نہیں۔ پہلی صورت میں عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ فہمائش کرکے ان کو باہمی جنگ سے روکیں۔ اگر فہمائش سے باز نہ آئیں تو امام المسلمین پر اصلاح کرنا واجب ہے اگر حکومت اسلامیہ کی مداخلت سے دونوں فریق جنگ سے باز آگئے تو قصاص و دیت کے احکام جاری ہونگے۔ اور باز نہ آئیں تو دونوں فریق کے ساتھ باغیوں کا سا معاملہ کیا جائے اور ایک باز آگیا دوسرا ظلم و تعدی پر جما رہا تو دوسرا فریق باغی ہے اسکے ساتھ باغیوں کا معاملہ کیا جائے اور جس نے اطاعت قبول کرلی وہ فریق عادل کہلائے گا۔ اور باغیوں کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے اور مختصر جامع حکم یہ ہے کہ قبل قتال انکے ہتھیار چھین لئے جاویں گے اور اُن کو گرفتار کرکے توبہ کرنے کے وقت تک قید رکھیں گے اور عین قتال کی حالت میں اور قتال کے بعد اُن کی ذریت کو غلام یا لونڈی نہ بنائینگے اور ان کا مال مالِ غنیمت نہیں ہوگا البتہ توبہ کرنے تک اموال کو محبوس رکھا جائیگا توبہ کے بعد واپس دیدیا جائے گا۔ آیاتِ مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا، یعنی اگر بغاوت کرنے والا فرقہ بغاوت اور قتال سے باز آجائے تو صرف جنگ بند کردینے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اسبابِ جنگ اور باہمی شکایات کے ازالہ کی فکر کرو تاکہ دلوں سے بغض و عداوت نکل جاوے اور ہمیشہ کے لئے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے۔ اور چونکہ یہ لوگ امام المسلمین کے خلاف بھی جنگ کرچکے ہیں اس لئے ہوسکتا تھا کہ ان کے بارے میں پورا انصاف نہ ہو اسلئے قرآن نے تاکید فرمائی کہ دونوں فریق کے حقوق میں عدل و انصاف کی پابندی کی جائے (یہ سب تفصیل بیان القرآن سے لی گئی ہے اور اسمیں ہدایہ کے حوالہ سے ہے)

مسئلہ - اگر مسلمانوں کی کوئی بڑی طاقتور جماعت امام المسلمین کی اطاعت سے نکل جائے تو امام المسلمین پر لازم ہے کہ اول اُن کی شکایات سُنے ان کو کوئی شبہ یا غلط فہمی پیش آئی ہو تو اسکو دُور کرے اور اگر وہ اپنی مخالفت کی ایسی وجوہ پیش کریں جن کی بناء پر کسی امام و امیر کی مخالفت

شرعاً جائز ہے یعنی جن سے خود امام المسلمین کا ظلم و جور ثابت ہو تو عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس جماعت کی مدد کریں تاکہ امام اپنے ظلم سے باز آجائے بشرطیکہ اسکے ظلم کا ثبوت یقینی بلا کسی اشتباہ کے ثابت ہو جائے (کذا قال ابن الہمام۔ مظہری) اور اگر کوئی ایسی واضح وجوہ اپنی بغاوت اور عدم اطاعت کی بیان نہ کرسکیں اور امام المسلمین کیخلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں تو مسلمانوں کو اُن سے قتال کرنا حلال ہے اور امام شافعی رح نے فرمایا کہ جب تک وہ خود قتال شروع نہ کردیں اسوقت تک مسلمانوں کو اُن سے قتال کی ابتدا کرنا جائز نہیں (مظہری) یہ حکم اسوقت ہے جبکہ اس جماعت کا باغی اور ظالم ہونا بالکل یقینی اور واضح ہو، اور اگر صورت ایسی ہے کہ دونوں فریق کوئی شرعی حجت رکھتے ہیں اور یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون باغی ہے کون عادل وہاں جس شخص کو کسی ایک کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو وہ اسکی مدد کرسکتا ہے اور جس کو کسی جانب رجحان نہ ہو وہ دونوں سے الگ رہے جیسا کہ مشاجراتِ صحابہ کرام کے وقت جنگ جمل اور صفین میں پیش آیا۔

مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

امام ابوبکر بن العربی نے فرمایا کہ یہ آیت قتال بین المسلمین کی تمام صورتوں کو حاوی اور شامل ہے اسمیں وہ صورت بھی داخل ہے جسمیں دونوں فریق کسی حجتِ شرعی کے تحت جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں صحابہ کرام کے مشاجرات اسی قسم میں داخل ہیں۔ قرطبی نے ابن عربی کا یہ قول نقل کرکے اس جگہ مشاجرات صحابہ جنگ جمل اور صفین وغیرہ کی اصل حقیقت بیان کی ہے اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعد کے آنیوالے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ احقر نے یہ سب مضامین احکام القرآن میں بزبان عربی اور بزبان اُردو اپنے رسالہ مقامِ صحابہ میں تفصیل کیساتھ لکھدیئے ہیں یہاں اسکا خلاصہ جو تفسیر قرطبی ص۳۳۲ ج۱۶ کے حوالہ سے اس رسالہ میں دیا گیا ہے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کیطرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اسلئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرزِ عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا، اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کفِ لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی کہ اللہ نے انھیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے" اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ رض کے بارے میں فرمایا،

ان طلحۃ شہید یمشی علی وجہ الارض، یعنی طلحہ روئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں،

اب اگر حضرت علی رض کے خلاف حضرت طلحہ رض کا جنگ کے لئے نکلنا کھلا گناہ اور عصیان تھا تو اس جنگ میں مقتول ہو کر وہ ہرگز شہادت کا رُتبہ حاصل نہ کرتے، اسی طرح حضرت طلحہ رض کا یہ عمل تاویل کی غلطی اور ادائے واجب میں کوتاہی قرار دیا جاسکتا تو بھی آپ کو شہادت کا مقام حاصل نہ ہوتا، کیونکہ شہادت تو صرف اسوقت حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اطاعتِ ربانی میں قتل ہوا ہو۔ لہٰذا ان حضرات کے معاملہ کو اسی عقیدہ پر محمول کرنا ضروری ہے جسکا اوپر ذکر کیا گیا

اس بات کی دوسری دلیل وہ صحیح اور معروف و مشہور احادیث ہیں جو خود حضرت علی رض سے مروی ہیں اور جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "زبیر کا قاتل جہنم میں ہے"۔

نیز حضرت علی رض فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ "صفیہ رض کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی خبر دیدو" جب یہ بات ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت طلحہ رض اور حضرت زبیر رض اس لڑائی کی وجہ سے عاصی اور گنہگار نہیں ہوئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور حضرت طلحہ رض کو شہید نہ فرماتے اور حضرت زبیر کے قاتل کے بارے میں جہنم کی پیشین گوئی نہ کرتے۔ نیز ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے جن کے جنتی ہونے کی شہادت تقریباً متواتر ہے۔

اسی طرح جو حضرات صحابہ رض ان جنگوں میں کنارہ کش رہے، انھیں بھی تاویل میں خطاکار نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ان کا طرزِ عمل بھی اس لحاظ سے درست تھا کہ اللہ نے ان کو اجتہاد میں اسی رائے پر قائم رکھا جب یہ بات ہے تو اس وجہ سے ان حضرات پر لعن طعن کرنا ان سے برات کا اظہار کرنا اور انھیں فاسق قرار دینا، ان کے فضائل و مجاہدات اور ان عظیم دینی مقامات کو کالعدم کردینا کسی طرح درست نہیں۔ بعض علماء سے پوچھا گیا کہ اس خون کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو صحابہ کرام رض کے باہمی مشاجرات میں بہایا گیا تو انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھدی کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یہ ایک اُمت تھی جو گزر گئی، اسکے اعمال اسکے لئے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لئے ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

کسی اور بزرگ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا، "ایسے خون ہیں کہ اللہ نے میرے ہاتھوں کو ان میں (رنگنے سے) بچایا، اب میں اپنی زبان کو ان سے آلودہ نہیں کروں گا" مطلب یہی تھا کہ میں کسی ایک فریق کو کسی ایک معاملے میں یقینی طور پر خطاکار ٹھہرانے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔

علامہ ابن فورک فرماتے ہیں:۔

"ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رض کے درمیان جو مشاجرات ہوئے انکی مثال

ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کی، وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے۔ بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کا بھی ہے۔"

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ،

"جہانتک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اسکے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا۔ اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کے باہمی قتال کے بارے میں پُوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ،

"ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے، جس معاملہ پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملہ میں اُن کے درمیان اختلاف ہے اسمیں سکوت اختیار کرتے ہیں۔"

حضرت محاسبی فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے۔ لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جسمیں انکا اختلاف ہو اس میں خاموشی اختیار کریں اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی تھی اس لئے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا

اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسرے سے شاید وہ بہتر ہوں

مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْۤا

اُن سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور عیب نہ لگاؤ

اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ

ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے بُرا نام ہے گنہگاری پیچھے

الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑪

ایمان کے اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ

ان (ہنسنے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتے ہیں) اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ اُن (ہنسنے والیوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتی ہیں) اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو (کیونکہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں اور) ایمان لانے کے بعد (مسلمان پر) گناہ کا نام لگنا (ہی) بُرا ہے (یعنی یہ گناہ کر کے تمھاری شان میں یہ کہا جاسکتا کہ فلاں مسلمان جس سے تم مراد ہو گناہ یعنی خدا کی نافرمانی کرتا ہے نفرت کی بات ہے تو اس سے بچو) اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آویں گے تو وہ ظلم کرنے والے (اور حقوق العباد کو تلف کرنے والے) ہیں (جو سزا ظالموں کو ملے گی وہی اُن کو ملے گی)

مَعارف ومَسائل

سورۂ حجرات کے شروع میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب کا بیان آیا پھر عام مسلمانوں کے باہمی حقوق وآداب معاشرت کا بیان شروع ہوا، سابقہ دو آیتوں میں انکی اجتماعی وجماعتی اصلاح کے احکام بیان ہوئے، مذکور الصدر آیتوں میں اشخاص وافراد کے باہمی حقوق وآداب معاشرت کا ذکر ہے۔ ان میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اوّل کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر واستہزاء کرنا، دوسرے کسی پر طعنہ زنی کرنا، تیسرے کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا جس سے اسکی توہین ہوتی ہو یا وہ اُس سے بُرا مانتا ہو۔

پہلی چیز سخریہ یا تمسخر ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ کسی شخص کی تحقیر وتوہین کے لئے اُس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ، تمسخر، استہزاء کہا جاتا ہے اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے اسکی نقل اُتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اسکا کلام سُنکر بطور تحقیر کے ہنسی اُڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ وتمسخر کسی شخص کے سامنے اسکا ایسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اُس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بنصِ قرآن حرام ہیں۔

سخریہ کی ممانعت کا قرآنِ کریم نے اتنا اہتمام فرمایا کہ اسمیں مردوں کو الگ مخاطب فرمایا عورتوں کو الگ، مردوں کو لفظ قوم سے تعبیر فرمایا، کیونکہ اصل میں یہ لفظ مردوں ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجازاً اور توسعاً عورتوں کو اکثر شامل ہوجاتا ہے اور قرآن کریم نے عموماً لفظ قوم مردوں عورتوں دونوں ہی کے لئے استعمال کیا ہے مگر یہاں لفظ قوم خاص مردوں کیلئے استعمال

فرمایا اسکے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ نِساء سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کیساتھ استہزاء و تمسخر کرتا ہے اسکو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنیوالے سے بہتر ہو اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کیساتھ استہزاء و تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اسکو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ قرآن میں مَردوں کا مَردوں کیساتھ اور عورتوں کا عورتوں کیساتھ استہزاء کرنے اور اسکی حرمت کا ذکر فرمایا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کیساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کیساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اسکا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اسطرف ہے کہ عورتوں اور مَردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آوے تو کسی کو اسپر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرأت نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔ اس آیت کو سن کر سلف صالحین کا حال یہ ہوگیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اُسپر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کُتا نہ بنا دیا جاؤں (قرطبی)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کی صورتوں اور انکے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ اُن کے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے قرطبی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ اور اصل یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کے معاملہ میں اسکے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال و افعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اسکے باطنی حالات اور قلبی کیفیات کو جانتا ہے وہ اسکے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حال اور اعمال بُرے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اسکے باطنی حالات اور قلبی کیفیات اسکے اعمالِ بد کا کفارہ بن جائیں اسلئے جس شخص کو بُری حالت یا بُرے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اُس کی اس حالت کو تو بُرا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے وہ لَمز ہے۔ لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا

ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے کیونکہ اکثر تو ایسا واقع ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے آپ کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے یہی معنی یہاں لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے تو کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اسکے عیب نکالو گے تو وہ تمھارے عیب نکالیگا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ وفیک عیوب وللناس اعین، یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو اُن کو دیکھتی ہیں تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کروگے تو وہ تم پر یہی عمل کرینگے اور بالفرض اگر اسنے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل و تحقیر ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اسمیں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کریگا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملیگی۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفر نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر ۔ پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر، تو جہان میں کوئی بُرا نہ رہا

تیسری چیز جس سے آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو بُرے لقب سے پکارنا ہے، جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ جیسے کسی کو لنگڑا لولا یا اندھا کانا کہہ کر پکارنا یا اس لفظ سے اسکا ذکر کرنا اسی طرح جو نام کسی شخص کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اُس نام سے اُس کو پکارنا۔ حضرت ابوجبیرہ انصاری رضؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ہم میں اکثر آدمی ایسے تھے جن کے دو یا تین نام مشہور تھے اور ان میں سے بعض نام ایسے تھے جو لوگوں نے اس کو عار دلانے اور تحقیر و توہین کے لئے مشہور کر دیئے تھے۔ آپؐ کو یہ معلوم نہ تھا بعض اوقات وہی بُرا نام لیکر آپؐ اس کو خطاب کرتے تو صحابہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ وہ اس نام سے ناراض ہوتا ہے اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں تنابز بالالقاب سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا بُرا عمل کیا ہو اور پھر اُس سے تائب ہوگیا ہو اسکے بعد اس کو اُس بُرے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور یا زانی یا شرابی وغیرہ۔ جس نے چوری زنا، شراب سے توبہ کرلی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس سے اُس نے توبہ کرلی ہے تو اللہ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اسکو اسی گناہ میں مبتلا کرکے دنیا و آخرت میں رسوا کرے گا (قرطبی)

بعض القاب کا استثناء بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہٖ بُرے ہیں مگر وہ بغیر اُس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جس کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اسانیدِ حدیث میں بعض ناموں کیساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً حمید الطویل۔ سلیمان الاعمش۔ مروان الاصفر وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا قصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے (قرطبی)

سُنت یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے القاب سے یاد کیا جائے حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ ہے کہ اسکا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اُس کو زیادہ پسند ہو اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں۔ صدیقِ اکبر کو عتیق اور حضرت عمرؓ کو فاروق اور حضرت حمزہ کو اسد اللہ[1] اور خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ

اے ایمان والو بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت

الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ

گناہ ہے اور جید نہ ٹٹولو کسی کا اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے

اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا

تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مُردہ ہو سو گھن آتا ہے تم کو اس سے اور ڈرتے

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲

رہو اللہ سے، بیشک اللہ معاف کرنیوالا ہے مہربان

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (اس لئے ظن و گمان کی جتنی قسمیں ہیں اُن سب کے اقسام کے احکام کی تحقیق کر لو کہ کونسا گمان جائز ہے کونسا ناجائز، پھر جائز کی حد تک رہو) اور (کسی کے عیب کا) سُراغ نہ لگایا کرو اور کوئی کسی

[1] دیکھئے مجمع الزوائد ص ۲۹۶ ج ۲ - محمود اشرف عثمانی۔

کی غیبت بھی نہ کیا کرے (آگے غیبت کی مذمت ہے کہ) کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے اس کو تو تم (ضرور) بُرا سمجھتے ہو (تو سمجھ لو کہ کسی بھائی کی غیبت بھی اسی کے مشابہ ہے) اور اللہ سے ڈرتے رہو (غیبت چھوڑ دو توبہ کر لو) بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

یہ آیت بھی باہمی حقوق اور آداب معاشرت کے متعلق احکام پر مشتمل ہے اسمیں بھی تین چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اوّل ظن جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرے تجسّس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سُراغ لگانا۔ تیسرے غیبت یعنی کسی غیر حاضر آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سُنتا تو اس کو ناگوار ہوتی۔ پہلی چیز یعنی ظن کے معنی گمان غالب کے ہیں، اسکے متعلق قرآن کریم نے اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ "بہت سے گمانوں سے بچا کرو" پھر اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں" جس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں تو یہ ارشاد سننے والوں پر اس کی تحقیق واجب ہو گئی کہ کونسے گمان گناہ ہیں تاکہ اُن سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو جاوے اسکے پاس نہ جائیں۔ علماء و فقہاء نے اسکی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ قرطبی نے فرمایا کہ ظن سے مراد اس جگہ تہمت ہے یعنی کسی شخص پر بغیر کسی قوی دلیل کے کوئی الزام عیب یا گناہ کا لگانا۔ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں ایک جامع تفصیل اس طرح لکھی ہے کہ ظن کی چار قسمیں ہیں ایک حرام ہے دوسری مامور بہ اور واجب ہے، تیسری مستحب اور مندوب ہے چوتھی مباح اور جائز ہے۔ ظنِ حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دیگا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہی ہو۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لا یموتن احدکم الا وھو یحسن الظن باللہ | تم میں سے کسی کو اسکے بغیر موت نہ آنی چاہیئے کہ اسکا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو

اور ایک حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ انا عند ظن عبدی بی، یعنی اپنے بندے کیساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اب اس کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کیساتھ حُسنِ ظن فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے۔ اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں اُن کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مُراد باتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور جو کام ایسے ہیں کہ اُن میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اسکے متعلق قرآن و سُنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسے باہمی منازعات و مقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیونکہ حاکم اور قاضی جسکی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اُس پر اسکا فیصلہ دینا واجب ضروری ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن و حدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اسکے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان و احتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اسوقت جھوٹ بولا ہو اس لئے اسکا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کی جاسکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہو تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے اور ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جاوے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دیکر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے اور ظن مستحب و مندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کیساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے (جصاص ملخصاً)

قرطبی نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا، اسمیں حُسن ظن بالمؤمنین کی تاکید آئی ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ ان من الحزم سوء الظن یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے اسکا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے نہ یہ کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملے میں احتیاط برتے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے ؎

نگہ دارد آں شوخ درکیسہ دُر ۔۔۔ کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

دوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے تجسُّس یعنی کسی کے عیب کی تلاش اور سُراغ لگانا ہے۔ اس میں قراءتیں دو ہیں ایک لَا تَجَسَّسُوۡا بالجیم دوسرے لَا تَحَسَّسُوۡا بالحاء، اور حدیث صحیحین میں جو حضرت ابوہریرہ رضؓ سے منقول ہے یہ دونوں لفظ آئے ہیں ارشاد ہے لا تجسسوا ولا تحسسوا اور ان دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں۔ اخفش نے دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تجسس بالجیم کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور

تحسُّس بالحاء مطلق تلاش اور جستجو کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ یوسف میں فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَ اَخِیۡہِ اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو چیز تمھارے سامنے آجائے اسکو پکڑ سکتے ہو اور کسی مسلمان کا جو عیب ظاہر نہ ہو اُس کی جستجو اور تلاش کرنا جائز نہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتھم فان من اتبع عوراتھم یتبع اللہ عورتہ ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ (قرطبی)	مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور اُن کے عیوب کی جستجو نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رُسوا کر دیتا ہے

بیان القرآن میں ہے کہ چھپ کر کسی کی باتیں سُننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سُننا بھی تجسُّس میں داخل ہے البتہ اگر کسی سے مضرت پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے مضرت پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے یعنی اس کی غیر موجودگی میں اسکے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سُنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دِہ بات کہنا جائز ہے۔ کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے جس کی حُرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا، اس آیت نے کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین و تحقیر کو اسکا گوشت کھانے کی مثل و مشابہ قرار دیا ہے اگر اس کے وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کرکے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ اور آگے آئیگا وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ اور وہ آدمی غائب ہو اسکے پیچھے اسکے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اُس کی آبرو میں خلل آئے اور اُس کی تحقیر ہو یہ ایسا ہے جیسے کسی مُردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مُردہ کا گوشت کھانے سے مُردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسا کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خست و دنارت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خست و دنارت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسّس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حُرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دیکر اُس کی حُرمت اور خست و دنائت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اُس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذا رسانی کی بنا پر حرام ہے مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کرسکتا ہے اور مدافعت کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادۃً زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کرسکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لئے اسکا سلسلہ بھی عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلا بھی زیادہ ہے اس لئے غیبت کی حرمت زیادہ مؤکد کی گئی۔ اور عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سُنے وہ اپنے غائب بھائی کیطرف سے بشرطِ قدرت مدافعت کرے اور مدافعت پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اسکے سُننے سے پرہیز کرے کیونکہ غیبت کا بقصد و اختیار سُننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

غیبت کے متعلق مسائل حضرت میمون رح نے فرمایا کہ ایک روز خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک زنگی کا مُردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کرکے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے بندے میں اس کو کیوں کھاؤں تو اُس شخص نے کہا اسلئے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے تو اسکے متعلق کوئی اچھی بُری بات کی ہی نہیں تو اُس شخص نے کہا کہ ہاں، لیکن تو نے اس کی غیبت سُنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمون رح کا حال اس خواب کے بعد یہ ہوگیا کہ نہ خود کبھی کسی کی غیبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔

حدیث میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ شبِ معراج کی حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لیجایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور اُن کی آبرو ریزی کرتے تھے (رواہ البغوی۔ مظہری) اور حضرت ابوسعید اور جابر رض سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، الغیبۃ اشدّ من الزّنا، یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے تو اسکا گناہ معاف ہوجاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اسوقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے (رواہ الترمذی و ابوداؤد۔ از مظہری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے

اور حق العبد بھی ضائع ہوتا ہے اسلئے جس کی غیبت کی گئی ہے اُس سے معاف کرانا ضروری ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ غیبت کی خبر جب تک صاحبِ غیبت کو نہ پہنچے اسوقت تک وہ حق العبد نہیں ہوتی اسلئے اُس سے معافی کی ضرورت نہیں (نقلہ فی الروح عن محمد بن المنیاطی وابن الصباغ والنووی وابن الصلاح والزرکشی ابن عبدالبر عن ابن المبارک) مگر بیان القرآن میں اسکو نقل کرکے فرمایا ہے کہ اس صورت میں گو اس شخص سے معافی مانگنا ضروری نہیں مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اسکے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ضروری ہے اور اگر وہ شخص مرگیا ہے یا اسکا پتہ نہیں تو اسکا کفارہ حضرت انسؓ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان من کفارۃ الغیبۃ ان یستغفر لمن اغتابہ تقول اللّٰھمّ اغفرلنا ولہ (رواہ البیہقی۔ مظہری) یعنی کفارہ غیبت کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔

مسئلہ ۔ بچے اور مجنون اور کافر ذمّی کی غیبت بھی حرام ہے کیونکہ انکی ایذا بھی حرام ہے اور جو کافر حربی ہیں اگرچہ انکی ایذا حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کیوجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

مسئلہ ۔ غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے جیسے کسی لنگڑے کی چال بناکر چلنا جس سے اُس کی تحقیر ہو۔

مسئلہ ۔ بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوئی ہے مثلاً کسی شخص کی بُرائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت و مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کرسکے، یا کسی کی اولاد و بیوی کی شکایت اُس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو اُن کی اصلاح کرسکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لئے صورتِ واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دُنیوی شر سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لئے اسکا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے اس کے اعمالِ بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں مگر بلا ضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی بنا پر مکروہ ہے (یہ سب مسائل بیان القرآن میں بحوالہ رُوح المعانی بیان کئے گئے ہیں) اور ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی بُرائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اسکی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت و مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ

اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے

لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

تاکہ آپس کی پہچان ہو، تحقیق عزت اللہ کے یہاں اُسی کو بڑی جس کو ادب بڑا، اللہ سب کچھ جانتا ہے خبردار

خُلاصۂ تفسیر

اے لوگو ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم و حوا) سے پیدا کیا ہے (اسلئے اس میں تو سب انسان برابر ہیں) اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (یہ محض اسلئے) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (جسمیں بہت سی مصلحتیں ہیں نہ اسلئے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو کیونکہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے جسکا پورا حال کسی کو معلوم نہیں بلکہ اسکے حال کو محض) اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور پورا خبردار ہے (اسلئے کسی نسب اور قومیت پر فخر نہ کرو)

معارف و مسائل

اُوپر کی آیات میں انسانی اور اسلامی حقوق اور آدابِ معاشرت کی تعلیم کے سلسلے میں چھ چیزوں کو حرام و ممنوع کیا گیا ہے جو باہمی منافرت اور عداوت کا سبب ہوتی ہیں۔ اس آیت میں ایک جامع تعلیم انسانی مساوات کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے کو کمتر یا رذیل نہ سمجھے اور اپنے نسب اور خاندان یا مال و دولت وغیرہ کی بنا پر فخر نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں درحقیقت تفاخر کی ہیں نہیں، پھر اس تفاخر سے باہمی منافرت اور عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ اور خاندان اور قبائل یا مال و دولت کے اعتبار سے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہے۔

شانِ نزول | یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اسوقت نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا تو قریشِ مکہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اُن میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے اُن کو یہ روزِ بد دیکھنا نہیں پڑا، اور حارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی آدمی نہیں ملا کہ جو مسجد حرام میں اذان دے۔ ابوسفیان بولے کہ میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمانوں کا مالک ان کو خبر کر دیگا، چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا انھوں نے اقرار کر لیا اُسی پر یہ آیت نازل ہوئی جسنے بتلایا کہ فخر و عزت کی چیز درحقیقت ایمان اور تقویٰ ہے جس سے

تم لوگ خالی اور حضرت بلال آراستہ ہیں اسلئے وہ تم سب سے افضل و اشرف ہیں (مظہری عن البغوی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کی روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا (تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں) طواف سے فارغ ہو کر آپ نے یہ خطبہ دیا۔

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃ وتکبرھا۔ الناس رجلان بر تقی کریم علی اللہ و فاجر شقی ھین علی اللہ ثم تلا یاایھا الناس انا خلقنکم الآیۃ (ترمذی و بغوی)

شکر ہے اللہ کا جسنے فخر جاہلیت کو اور اسکے تکبر کو تم سے دُور کر دیا، اب تمام انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک نیک اور متقی وہ اللہ کے نزدیک شریف اور محترم ہے۔ دوسرا فاجر شقی وہ اللہ کے نزدیک ذلیل و حقیر ہے اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ دُنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت مال و دولت کا نام ہے اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کا۔

شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ، شعوب، شعب کی جمع ہے بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں پھر اُن میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں۔ پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اسکے مختلف حصّوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں۔ سب سے بڑا حصّہ شعب اور سب سے چھوٹا حصّہ عشیرہ کہلاتا ہے۔ ابوالبرداق کا قول ہے کہ شعب اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں، اور قبائل عرب کے لوگوں کے لئے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور اسباط بنی اسرائیل کے لئے۔

نسبی اور وطنی یا لسانی امتیاز میں حکمت و مصلحت تعارف کی ہے

قرآن کریم نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے مگر پھر اس کی تقسیم مختلف قوموں قبیلوں میں جو حق تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے اُس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کا تعارف اور شناخت آسان ہو جائے مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے تفاوت سے انمیں امتیاز ہو سکتا ہے اور اس سے دُور اور قریب کے رشتوں کا علم ہو سکتا ہے اور نسبی قرب و بعد کی مقدار پر ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جاتے ہیں۔ عصبات کا قرب و بعد معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کیلئے استعمال کرو تفاخر کے لئے نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا

کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی

يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ

نہیں گھسا ایمان تمہارے دلوں میں اور اگر حکم پر چلو گے اللہ کے اور اسکے رسول کے کاٹ نہ لے گا

مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑭ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ
تمہارے کاموں میں سے کچھ اللہ بخشتا ہے مہربان ہے ایمان والے وہ لوگ ہیں
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
جو ایمان لائے اللہ پر اور اسکے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ
اپنی جان سے وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے تو کہہ کیا تم جتلاتے ہو
اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ
اللہ کو اپنی دینداری اور اللہ کو تو خبر ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑯ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا
ہر چیز کو جانتا ہے تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے تو کہہ مجھ پر احسان نہ
عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ
رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُسنے تم کو راہ دی ایمان کی
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑰ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
اگر سچ کہو اللہ جانتا ہے چھپے بھید آسمانوں کے اور زمین کے
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑱ ع ۱۴
اور اللہ دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو

خُلاصۂ تفسیر

یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آکر جو ایمان لانیکے مدعی ہوتے ہیں، یہ اس میں کئی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو کذب کہ بلا تصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر، اور وہ موجود نہیں جیسا عنقریب آتا ہے وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے اور لباقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ و رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہونگے محض اسوقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو کہ اسوقت کے اعتبار سے

گزشتہ ہوگا) ذرا بھی کم نہ کریگا (بلکہ سب کا پورا پورا ثواب دے گا کیونکہ) بیشک اللہ غفور رحیم ہے (اب ہم سے سُنو کہ کامل مومن کون ہیں تاکہ اگر تم کو مومن بننا ہے تو ویسے بنو سو) پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لائے پھر (ایمان پر مستمر بھی رہے یعنی عمر بھر کبھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستہ میں (یعنی دین کے لئے) محنت اُٹھائی (جس میں جہاد وغیرہ سب آگیا سو) یہ لوگ ہیں سچے (یعنی پورے سچے اور یوں اگر صرف تصدیق ہی ہو تب بھی نفس صدق ہو جائیگا، بخلاف تمہارے کہ ادنیٰ درجہ کا ایمان کہ تصدیق ہے وہ تک حاصل نہیں اور دعویٰ کرتے ہیں ایمان کامل کا، پس ایک امر قبیح تو اُن سے یہ صادر ہوا یعنی کذب کما قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا اِلٰى قولہ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، اور دوسرا امر قبیح یہ ہے کہ یہ دھوکہ دیتے ہیں کما قال تعالیٰ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ سو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ کیا خدا تعالیٰ کو اپنے دین (قبول کرنے) کی خبر دیتے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ تم نے ایمان قبول نہیں کیا باوجود اسکے جو تم دعوے قبول کرنے کا کرتے ہو تو لازم آتا ہے کہ خلاف علم خدا وندی خدا تعالیٰ کو ایک بات بتلاتے ہو حالانکہ (یہ محال ہے کیونکہ) اللہ کو تو سب آسمان اور زمین کی سب چیزوں کی (پوری) خبر ہے اور (علاوہ سمٰوٰت والارض کے) اللہ (اور بھی) سب چیزوں کو جانتا ہے (تو اس کو کوئی کیا بتلا دیگا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو جو تمہارے متعلق علم ہے کہ تم ایمان نہیں لائے وہی صحیح ہے اور تیسرا امر قبیح جس کے یہ مرتکب ہوتے ہیں یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے اسلام لانیکا آپ پر احسان رکھتے ہیں (جو نہایت درجہ گستاخی ہے کہ دیکھئے ہم نہ لڑے نہ بھڑے مسلمان ہو گئے اور دوسرے لوگ بہت پریشان کر کرکے مسلمان ہوئے ہیں سو) آپ کہدیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو (اس لئے کہ قطع نظر گستاخی کے تمہارے اسلام سے میرا کیا نفع ہو گیا اور اسلام نہ لانے سے میرا کیا ضرر ہو گیا اگر تم سچے ہوتے تو تمہاری ہی آخرت کا نفع تھا اور جھوٹے ہونے میں بھی تمہارا ہی دنیا کا نفع ہے کہ قتل و قید سے بچ گئے سو مجھ پر احسان رکھنا محض جہل ہے) بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اُسنے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم (اس دعوئ ایمان میں) سچے ہو (کیونکہ ایمان بڑی نعمت ہے اور بدون تعلیم و توفیق حق تعالیٰ کے نصیب نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ ایسی بڑی نعمت عطا فرما دی، پس دھوکے اور احسان جتلانے سے باز آؤ اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی سب مخفی باتوں کو جانتا ہے اور (اسی علم محیط کی وجہ سے) تمہارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے (اور اُن ہی کے موافق تم کو جزا دیگا پھر اُسکے سامنے باتیں بنانے سے کیا فائدہ)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و شرافت کا مدار تقویٰ پر ہے جو ایک باطنی چیز ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں کسی شخص کے لئے اپنے تقدس کا دعویٰ جائز نہیں، مذکور الصدر آیات میں ایک خاص واقعہ کی بنار پر یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل مدار قلبی تصدیق پر ہے اسکے بغیر محض زبان سے اپنے کو مؤمن کہنا صحیح نہیں، اس پوری سورت میں اول نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق تعظیم و تکریم کا پھر باہمی حقوق اور آداب معاشرت کا ذکر آیا ہے ختم سورت پر یہ بتلایا گیا کہ آخرت میں سب اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان اور تصدیقِ قلبی اور اللہ و رسول کی اطاعت پر ہے۔

شانِ نزول واقعہ اس آیت کے نزول کا امام بغوی رہ کی روایت کیمطابق یہ ہے کہ قبیلہ بنی اسد کے چند آدمی مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک قحط شدید کے زمانے میں حاضر ہوئے، یہ لوگ دل سے تو مؤمن تھے نہیں محض صدقات حاصل کرنے کے لئے اپنے اسلام لانے کا اظہار کیا، اور چونکہ واقع میں مؤمن نہ تھے اسلامی احکام و آداب سے بے خبر اور غافل تھے انھوں نے مدینہ کے راستوں پر غلاظت و نجاست پھیلادی اور بازاروں میں اشیار ضرورت کی قیمت بڑھادی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک تو جھوٹا دعویٰ ایمان لانیکا کیا، دوسرے آپ کو دھوکا دینا چاہا، تیسرے آپ پر احسان جتلایا کہ دوسرے لوگ تو ایک زمانہ تک آپکے برسرپیکار رہے آپکے خلاف جنگیں لڑیں پھر مسلمان ہوئے ہم بغیر کسی جنگ کے خود آپ کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے اسلئے ہماری قدر کرنی چاہیئے جو شانِ رسالت میں ایک طرح کی گستاخی بھی تھی کہ اپنے مسلمان ہوجانیکا احسان آپ پر جتلایا، اور مقصود اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے صدقات سے اپنی مفلسی دُور کریں۔ اور اگر یہ واقعی اور سچے مسلمان ہی ہوجاتے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا احسان تھا خود اپنا ہی نفع تھا اس پر آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جن میں اُن کے جھوٹے دعوے کی تکذیب اور احسان جتلانے پر مذمت کی گئی ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، چونکہ ان کے دلوں ایمان نہ تھا جھوٹا دعویٰ صرف ظاہری افعال کی بنار پر کر رہے تھے اسلئے قرآن نے انکے ایمان کی نفی اور دعوائے ایمان کے غلط ہونیکو بیان کرکے یہ فرمایا کہ تمھارا آمنّا کہنا تو جھوٹ ہے تم زیادہ سے زیادہ اسلمنا کہہ سکتے ہو کیونکہ اسلام کے لفظی معنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنے کے ہیں اور یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لئے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے لگے تھے اس لئے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہوگئی اسلئے لغوی معنی کے اعتبار سے اسلمنا کہنا صحیح ہوسکتا ہے۔

۹

اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟ اوپر کی تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں اسلام کے لُغوی معنی مراد ہیں اصطلاحی معنی مُراد ہی نہیں اس لئے اس آیت سے اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا۔ اور اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسُول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمالِ ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کی اطاعت کرنے کا لیکن شریعت میں تصدیقِ قلبی اسوقت تک قابلِ اعتبار نہیں جب تک اسکا اثر جوارح کے اعمال و افعال تک نہ پہنچ جائے جسکا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمۂ اسلام کا اقرار کرے۔ اسیطرح اسلام اگرچہ اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اسوقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے ورنہ وہ نفاق ہے۔ اس طرح اسلام و ایمان مبدأ اور منتہیٰ کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہو کر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعالِ ظاہرہ سے شروع ہو کر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں، اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مؤمن نہ ہو یا مؤمن ہو مُسلم نہ ہو مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان و اسلام میں ہے لغوی معنی کے اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو مؤمن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعتِ احکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مؤمن نہ تھے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمّت بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ سورۃ الحجرات للثامن
من شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ یوم الاحد وللہ الحمد والمنۃ